پروفیسر ڈاکٹر اصغر عباس
سابق صدر، شعبۂ اُردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، ہندوستان

شبلی نعمانی کی غیر مدوّن پہلی تقریر

شبلی نعمانی کی یہ ایک اہم تقریر ہے جو دستاویزی اہمیت کی حامل ہے اور
اس دور کے سیاسی و تعلیمی پس منظر پر بھی روشنی ڈالتی ہے (مدیران)

ABSTRACT

Shibli's first, uncompiled speech
By Prof. Dr. Ashgar Abbas, Former Chairman, Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh, India.

Shibli No'mani is among the writers who played a vital role in subcontinent's mental, social and educational revolution. Almost all of Shibli's writings have been collected, edited and published. But the speech he made at Aligarh College on July 31,1882, has not yet been reproduced and even Syed Sulaiman Nadvi's works on Shibli do not include this speech. The article gives the historical background and reproduces the speech, extracted from August 5,1882, issue of Aligarh Institute Gazette.

بلاد پورب جس میں غازی پور، گورکھ پور، بستی، بنارس اور اعظم گڑھ کے اضلاع شامل ہیں۔ ان میں سرسید کا بعض جگہوں پر عرصے تک اور بعض جگہ مختصر قیام رہا ہے۔ یہاں وہ اپنے کارِ منصبی کے علاوہ خشک سالی کی تباہیوں کو کم کرنے کے لیے بھی بھیجے گئے جس میں انھیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ قحط سالی سے پریشان عوام کے لیے اس دوران سرسید نے وہ ساری خدمات انجام دیں جن کے لیے آج مدر ٹریسا ممتاز ہیں۔

میر تقی میرؔ جب لکھنؤ گئے تو پورب کے ساکنوں سے انھیں شکایت پیدا ہوئی لیکن جب سرسید اس دیار میں پہنچے تو انھوں نے یہاں کے باسیوں کے طرز و انداز، کھان پان اور علم و عمل پر اعتماد کیا اور یہاں کے باشندوں نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور سرسید کے لیے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ غازی پور میں انھوں نے اپنی زندگی کے پہلے اہم منصوبے کا خاکہ بنایا اور سائنٹفک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ بہت اہم بات لکھی ہے کہ سرسید نے سائنس کو قبول کر کے ہمیں مذہب اور سائنس کی اس پیکار سے بچا لیا جس میں یورپ برسوں گرفتار رہا ہے۔ پھر یہی پورب کی سرزمین تھی جہاں سے سرسید تحریک کا سورج طلوع ہوا جس کی ضو سارے عالم میں پھیل گئی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ۱۸؍ستمبر ۱۸۳۲ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اعظم گڑھ کو غازی پور سے علیٰحدہ کر کے اسے ایک ضلع بنا دیا اور وہاں ایک ڈپٹی کلکٹر تعینات کر دیا لیکن اس کے باوجود عرصے تک اس کا رابطہ غازی پور کی عدالتوں سے استوار رہا۔ قاضی عنایت رسول چریاکوٹی (۱۸۲۸ء۔ ۱۹۰۲ء) اور قاضی محمد فاروق چریاکوٹی (و۔ ۱۹۰۹ء) کے والد قاضی علی اکبر غازی پور میں سرسید کے اجلاس میں وکالت کرتے تھے، وہ سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے پہلے دن سے اس کے ممتاز ممبر تھے۔ اس زمانے میں یہ شہر اہلِ علم وفن کا مسکن بن گیا تھا۔ قاضی عنایت رسول کو عبرانی زبان پر اتنا عبور تھا کہ تبیین الکلام کی تصنیف کے دوران بعض مشکلات کے سلسلے میں سرسید ان سے مدد لیتے تھے۔ بنارس میں کمیٹی خواستگار ترقیِ تعلیمِ مسلمانان کے پہلے جلسے کی صدارت قاضی عنایت رسول نے کی تھی۔ اسی دوران ایک عبرانی اہلِ زبان سالم بھی غازی پور میں موجود تھا جس سے سرسید عبرانی کا درس لیتے تھے۔ قاضی علی اکبر کے برادر نسبتی احمد علی بھی یہاں موجود تھے جو یونانی زبان کے زبردست اسکالر تھے۔ ان دنوں انگریزی کے صاحب قلم ''جی۔ ایف۔ آئی گراہم'' بھی موجود تھے جنھیں بعد میں سرسید کے پہلے سوانح نگار کا شرف حاصل ہوا۔ یہاں بابو درگا پرشاد تھے جو سائنس کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر رہے تھے۔ غازی پور میں بقول شبلی ''ہماری علمی عزت کا آخری سہارا مولوی فیض الحسن کاندھلوی بھی تھے جن سے دہلی میں سرسید نے مقامات حریری کا درس لیا تھا اور یہاں انھیں سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں پر نظر ثانی کے لیے ایک معقول مشاہرہ پر بلایا تھا۔ بعد میں یہ عرصہ تک علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی سے منسلک رہے۔ اغلب خیال ہے کہ مولوی فیض الحسن سے شبلی کی دید شنید غازی پور سے ہے۔ بعد میں یہی انھیں لاہور لے گئی جہاں انھوں نے اورینٹل کالج میں مولوی فیض الحسن سے حماسہ کا درس لیا۔ یہیں رحمت اللہ فرنگی محلی کا مدرسہ چشمۂ رحمت بھی تھا جو شبلی کا پہلا مدرسہ تھا جہاں شبلی کے چہیتے استاد قاضی محمد فاروق چریاکوٹی علوم معقول ومنقول کا درس دیتے تھے۔ مولوی فاروق اپنے والد اور بھائی کے علی الرغم سرسید کے افکار کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے عوالی جواب مسدس حالؔی کے عنوان سے چوبیس صفحے کا ایک مسدس بھی لکھا ہے لیکن نظریاتی اختلاف کے باوجود جب علی گڑھ کالج قائم ہوا تو سرسید انھیں مدرسۃ العلوم کے زمرۂ اساتذہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ دلچسپ بات ہے کہ قاضی محمد فاروق ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ غرض غازی پور ان دنوں قدسی نفس بزرگوں کی آماج گاہ بن گیا تھا اور یہ شہر مشرق ومغرب کے قران السعدین کا سماں پیش کر رہا تھا۔

یہاں شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ کا بھی آنا جانا تھا، یہ فارسی کے منتہی اور پیشے سے وکیل تھے اور قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سرسید سے رابطہ غازی پور میں ان کی عدالت سے ہوا۔ دھیرے دھیرے وہ سرسید کے افکار ونظریات کے تار میں بندھتے چلے گئے اور جب علی گڑھ کالج قائم ہوا تو اس کے قیام کے دوسرے ہی سال شیخ حبیب اللہ نے اپنے بیٹے اور شبلی کے چھوٹے بھائی شیخ مہدی حسن کو علی گڑھ کالج میں داخل کر دیا۔ مہدی حسن کالج کے ممتاز طالب علم اور علی گڑھ انسٹی

ٹیوٹ گزٹ کے قلمی معاونین میں تھے۔

مدرسۃ العلوم کو سر ہملٹن گب نے اسلام میں پہلا جدید کالج بتایا ہے یہ اس زمانے میں اپنی الگ پہچان بنا رہا تھا۔ یہاں کے ہونہار اور ہمہ گیر آگہی رکھنے والے اساتذہ، علم و اخلاق سے بہرہ ور یہاں کے نوجوان طلبا، یہاں کی ذہنی اور تہذیبی زندگی جو اس زمانے میں ہندوستان کی ہر درس گاہ سے علیٰحدہ اپنی شناخت رکھتی تھی، یہاں کی انجمن آرائیاں، یہاں کی رنگا رنگ باتوں کا ذکر مہدی حسن جب شبلی سے کرتے ہوں گے تو قدرتی طور پر اس کالج کو دیکھنے کا شوق انھیں پیدا ہوتا ہوگا۔ اکتوبر ۱۸۸۱ء میں اپنے بھائی سے ملنے کے بہانے شیخ حبیب اللہ کے ساتھ شبلی علی گڑھ آئے اور ساتھ میں سرسید کی شان میں ایک عربی قصیدہ بھی لائے۔ دونوں باپ بیٹے کالج کے کمپاؤنڈ میں ٹھہرے، یہاں کے طلبا اور اساتذہ کی شائستہ اور دل کش سرگرمیاں شبلی کی آنکھوں کی راہ سے ان کے دل میں اُتر گئی۔ سرسید نے گزٹ میں لکھا کہ: ''ہم کو نہایت خوشی ہے کہ دونوں باپ بیٹوں نے ہمارے مدرسۃ العلوم کو اور طریقِ معاشرتِ طلبا کو حد سے زیادہ پسند فرمایا۔'' حسرت موہانی کا مصرعہ یاد آرہا ہے کہ ؎

تماشا کام یاب آیا تمنا بے قرار آئی

یہ اتفاق کی بات ہے کہ اسی دوران مدرسۃ العلوم کے فارسی اور عربی کے استاد مولوی عنایت احمد کی اسامی خالی ہوئی تھی۔ شبلی کے معاشی حالات بھی اس زمانے میں خاصے مایوس کن تھے وہ اعظم گڑھ اور بستی دونوں جگہ وکالت میں ناکام ہو گئے تھے۔ اتفاق سے ان دنوں یہاں اعظم گڑھ کے ڈپٹی محمد کریم (۱۸۳۵ء۔ ۱۸۹۲ء) بھی تھے جن کی صدارت میں ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم کا افتتاح ہوا تھا وہ سرسید کے ان دوستوں میں تھے جن کی بات وہ ٹال نہیں سکتے تھے۔ شبلی سے ان کے روابط اعظم گڑھ سے تھے۔

مئی ۱۸۸۲ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس اولڈ فیلڈ کے جانے کے بعد اس جگہ پر سید محمود کا تقرر ہوا تھا، انھوں نے ۸ رمئی ۱۸۸۲ء کو الٰہ آباد ہائی کورٹ کی پہلی بنچ میں اجلاس کیا تھا۔ یہ ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج تھے اس سلسلے میں ایک تہنیتی جلسہ اعظم گڑھ میں ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت راجہ سلامت شاہ (۱۸۳۵ء۔ ۱۹۱۲ء) نے کی تھی، ان کے اجداد نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڑھ کا شہر بسایا تھا اور قلعہ تعمیر کیا تھا، یہ اعظم گڑھ کے آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ اس جلسہ کے محرکوں میں محمد آباد گہنہ اعظم گڑھ کے منشی محمد اکرام بھی تھے جن کے نام پر سرسید ہال میں ایک کمرہ ہے۔ انھوں نے اپنے والد لطف محمد کی کالج میں یادگار تعمیر کرنے کے لیے مالی تعاون دیا تھا، سرسید سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ حبیب اللہ سے بھی ان کے روابط تھے۔ یہ کمیٹی خواست گار ترقیٔ تعلیم مسلمانان کے اہم ممبروں میں تھے۔

الٰہ آباد ہائی کورٹ میں سید محمود کی تقرری کے سلسلے میں اس جلسہ کے سکریٹری شبلی تھے انھیں اندازہ تھا کہ سید محمود

کالج کے معاملات میں کتنے دخیل ہیں خاص طور پر علی گڑھ کالج میں اساتذہ کے انتخاب میں ان کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔ سرسید سے بھی شبلی کی مراسلت ۱۸۷۹ء سے تھی۔ شبلی جب ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج کے زمرۂ اساتذہ میں آ گئے تو انھوں نے ۱۸۸۸ء میں سید محمود کی شادی کے موقع پر سہرا بھی پیش کیا تھا اور ان کے استاد محمد فاروق چریا کوٹی نے عربی میں بے غیر منقوط سہرا لکھا تھا۔

یہ تہنیتی جلسہ ۳۱/جولائی ۱۸۸۲ء کو اعظم گڑھ میں ہوا تھا۔ اس جلسہ میں اعظم گڑھ کے جن بااثر حضرات نے شرکت کی تھی ان کے اسمائے گرامی کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

راجہ سلامت شاہ، مرزا قمرالدین منصف، مولوی انعام اللہ خاں، منشی محمد اکرام وکیل سرکاری، شاہ اسداللہ وکیل عدالت، شاہ عبدالعلیم وکیل، شاہ عبدالقدیر وکیل، مولوی توجہ حسین وکیل، منشی چھیدی لال سررشتہ دار، شاہ زادہ عالی قدر مرزا احسن بخت پیش کار، شیخ حبیب اللہ وکیل، بابو محمد اصغر خاں رئیس سدھاری، خواجہ مولوی ولی اللہ خاں رئیس شہر، خواجہ احسن اللہ خاں رئیس شہر، سید محمد قاسم رئیس محمد آباد گہنہ، شاہ شجاعت عالم رئیس مئو، مولوی محمد شبلی۔

شبلی کی زیر نظر تقریر خطبات شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی میں شامل نہیں ہے۔ شبلی کی معلوم تقریروں میں یہ پہلی تقریر ہے جو انھوں نے ۲۱/جولائی ۱۸۸۲ء کو اعظم گڑھ میں مذکورہ بالا افراد کے درمیان پیش کی تھی۔ حیرت ہے کہ سید سلیمان ندوی جیسے دیدہ ور عالم نے حیاتِ شبلی رقم کرتے ہوئے سرسید اور شبلی کے سلسلے میں ایک اہم ماخذ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ورنہ شبلی کی پہلی تقریر نظرانداز نہ ہوتی۔ شبلی پر کام کرنے کے لیے سرسید پر نظر ضروری ہے۔ شبلی پر کام کرنے والے اسکالرز نے اکثر اس کا اہتمام نہیں کیا اسی لیے ان کے کام واجبی کے زمرہ میں آتے ہیں۔ شبلی کی تقریر ملاحظہ ہو:

> ''آج میں گورنمنٹ کا ضرور ممنونِ احسان ہوں مگر گورنمنٹ کا احسان آج کے موقع پر کچھ زیادہ ذکر کرنے کے لائق نہیں کیوں کہ میرا یقین ہے کہ گورنمنٹ نے ہمیشہ نہایت راستی سے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ جب ہم لوگ کسی منصب کی لیاقت پیدا کریں گے تو وہ کبھی ہم کو اس سے محروم نہ رکھے گی۔ پس اس کا یہ احسان ہمیشہ سے ہے اور اس نے کوئی نئی حالت نہیں پیدا کی ہے۔ میں آج اس بات کا زیادہ ذکر کروں گا کہ مسلمانوں نے وہ لیاقت پیدا کر لی ہے جس کے مدتوں سے منتظر تھے اور اس لیے میں اس نام ور شخص سید محمود کو مبارک باد دوں گا اور حضور جناب لفٹننٹ گورنر بہادر کا شکریہ ادا کروں گا کہ انھوں نے سید صاحب کی لیاقت کا پورا پورا

اندازہ کیا اور جو منصب کہ ان کے شایانِ شان تھا ان کو عطا فرمایا۔ گو مجھ کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور ان کا بخت خفتہ اب کروٹیں لینے لگا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اب بھی بہت سے مسلمان اپنے کہنہ خیالات کی گہری تاریکی سے نہیں نکلے اور ہنوز وہ بے ہودہ تقلید اور راہ و رسم عام سے وابستہ ہیں۔ گورنمنٹ نے ان کو ترقی کے زینہ تک پہنچا ہی نہیں دیا تھا بلکہ اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کو اوپر لینا چاہا مگر وہ اپنے انھیں بے ہودہ خیالات کے دباؤ سے جگہ سے ہل بھی نہ سکے۔ سید محمود صاحب ہی مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس بات کو نہ صرف خیالی بلکہ عملی طریقہ میں ثابت کر دکھایا کہ مسلمانوں کی ترقی اب ان کے ہاتھ میں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ سید محمود صاحب کی تقرری سے ترقی کا جو خیال مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں دوڑ گیا ہے اور جس قدر کہ اس موجودہ نتیجہ کو دیکھ کر وہ میدان ترقی میں نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ جانے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں اس قدر تحریک ان مجلسوں اور سوسائٹیوں سے بھی نہیں حاصل ہوئی ہے جو اس وقت تک اس غرض کے لیے گورنمنٹ یا مصلحانِ قوم کی طرف سے منعقد ہوتی رہی ہیں۔ اگر گورنمنٹ کا بھی اس تقرری سے یہی مقصود ہے تو غالباً کوئی دوسری پالیسی اس کی ہم سری نہیں کر سکتی اور یقیناً مسلمانوں کے مردہ اور افسردہ دلوں کے اُبھارنے کے لیے اس سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہے۔ مسلمان تو مغاک جہالت میں لمبی نیند لے رہے ہیں یہ توقع کہ وہ ایک خفیف تحریک سے بیدار ہو جاویں گے، بالکل بے سود ہے۔ سید محمود کی تقرری میں اکبر کی پالیسی کی چمک بھی موجود ہے جس کا منشا یہ ہے کہ پولٹیکل معاملات کے قصر عالی شان کی بنا ہندوستانی ارکان پر قائم کی جاوے۔ خوشامد اور بات ہے مگر ممالک مغربی و شمالی کے عام باشندے اس بات کو ضرور حسرت و افسوس کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ جس مجموعی جلسہ کے ہاتھ میں لاکھوں کی جانیں ہوں ان میں ہماری قوم کا ایک شخص بھی موجود نہ ہو۔ اس امر کی نسبت ایک مطبعانہ شکایت ضرور دلوں میں بلکہ بعض زبانوں پر بھی موجود تھی۔ سید محمود کی تقرری سے صرف یہی مطلب نہیں پورا ہوا بلکہ خاص مسلمانوں کی ایک دوسری شکایت کا

بھی سد باب ہو گیا۔ جیسا کہ مسلمانان کلکتہ کی عرض داشت میں ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمان اس بات کو بھی دل میں رکھتے تھے کہ مقدمات شرعیہ میں پوری تحقیق موشگافی صرف ایک مسلمان شخص ہی سے ممکن ہے۔ پس سید محمود کی تقرری صرف ایک خیالی خوشی کا باعث نہیں ہے بلکہ اس کا اثر واقعات پر بھی ایک وسیع اور معتد بہ اثر ہے۔ اخیر میں اپنے بیان کو ان فقروں پر ختم کروں گا ''سید محمود تو مبارک، تجھ کو تیرا عہدہ مبارک تو اپنے کو ایسا ثابت کر کہ گورنمنٹ تجھ سے بہتر کوئی شخص انتخاب نہ کر سکے۔ دیکھ ہوشیار رہ تیری رفتار میں لغزش نہ آئے۔ تجھ پر ہزاروں کی نگاہیں بلند رہیں۔'' اخیر میں سکریٹری (شبلی) نے اس بات کی تحریک کی کہ ایک تحریر شکریہ حضور نواب لفٹننٹ گورنر بہادر کی خدمت میں اس مجلس کی طرف سے ارسال کی جاوے اور روئداد جلسہ اخباروں میں مشتہر کرنے کے لیے صاحبانِ اخبار کی خدمت میں مرسل ہو۔ جناب شاہ عبدالعلیم صاحب رئیس محمد آباد وکیل عدالت نے اس تحریک کی تائید کی۔ صدر انجمن صاحب نے رضامندی ظاہر فرمائی اور بالاتفاق منظور ہوئی۔ اخیر میں سکریٹری نے صدر انجمن کا شکریہ تمام انجمن کی طرف سے ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔(۱)''

یہ تقریر شبلی کے دل میں موجزن اجتماعی درد یا فکر کی آئینہ دار ہے اسی کے ساتھ اس میں برطانوی استعمار کے خلاف نفرت اور سرکشی کا اظہار نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ اس میں سرسید کا سیاسی شعور پنہاں ہے۔ اس میں حاکم و محکوم کے ذہن و فکر کے بُعد کو کم کر کے ہم آہنگی پیدا کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ یہ شبلی کی پہلی تقریر ہے لیکن اس کے باوجود وہ خاصے با اعتماد دکھائی دیتے ہیں۔

آخر میں ایک عرض تمنا ہے جو میں اربابِ دارالمصنّفین (سرسید اکیڈمی کے وزن پر اب شبلی اکیڈمی) اور مسلم یونیورسٹی کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ شبلی کے مقالات، خطبات اور مکاتیب کو حواشی کے ساتھ نئے سرے سے شائع کیا جائے اور ان کا انگریزی میں ترجمہ کرایا جائے۔

۲۔ سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی لکھتے ہوئے نہ تو شبلی کے سچے پرستار کا حق ادا کیا ہے اور نہ ایک معقول سوانح نگار کا۔ انھوں نے سرسید، حالی اور نذیر احمد کے سلسلے میں اکثر باتیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر لکھی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ

حیات شبلی کو دید و دریافت اور تنقیدی جائزے کے بعد شائع کیا جائے اور اس کے بعد شمس الرحمن فاروقی صاحب سے جنھیں شبلی سے مناسبت بھی ہے، درخواست کی جائے کہ وہ حیات شبلی کو انگریزی کا جامہ پہنا دیں۔ اس وقت اردو دنیا میں اس کام کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہے۔

۳۔ انگریزی زبان کی یورش سے اردو زبان اب ایک بولی بنتی جا رہی ہے، یہی نہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر اچھی دست رس رکھنے والے بھی اب کم ہوتے جا رہے ہیں اس لیے اردو کے معتبر اہلِ قلم کی تحریروں کو انگریزی میں منتقل کرنے کا کام جلد ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک منصوبہ تیار کرنا چاہیے اور ترجمہ کا بیورو بنانا چاہیے اور سرسید کی تحریروں کے ترجمے سے اس کا آغاز کرنا چاہیے۔

حاشیہ:

(۱) یہ تقریر ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے شمارہ ۵، اگست ۱۸۸۱ء کے شمارے سے اخذ کی گئی ہے۔